علمِ اصولِ فقہ کی تدوین

شیخ محمد الخضری بک مرحوم

شریعت کے ماخذ خاتم الرسل سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے جو شریعت سماوی ہم تک پہنچی ہے اُس کا اصل منبع اللہ کی کتاب — قرآن کریم — ہے، اس کتاب کے مقاصد و مطالب کی تشریح و تبیین صاحبِ وحی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنے قول و عمل — یعنی سنت — سے فرمائی ہے۔ اس بنا پر دونوں، کتاب اللہ اور سنتِ رسول دین میں احکامِ شریعت کا اصل ماخذ اور اساسی ذریعۂ ثبوت قرار پائے۔ اربابِ اجتہاد و تفقہ، استنباطِ احکام اور استخراجِ مسائل میں انہی سرچشموں کی طرف رجوع کرتے رہے۔ ائمہ شریعت کی بصیرتِ دینی اور نگاہِ نکتہ شناس پر جب یہ حقیقت کھُلی کہ صاحبِ شریعت نے جو احکام و فرامین امت کو صادر فرمائے ہیں، وہ تمام ایسی حکمتوں سے پُر اور ایسی علتوں سے معلول ہیں جن کی بنیاد امت کے مصالح و منافع پر قائم ہے، تو ائمہ شریعت کے اس نظریے کے نتیجے میں کتاب و سنت ہی کے اندر سے ایک تیسرا ماخذِ شریعت — قیاس — معرضِ وجود میں آگیا۔ حکمِ شریعت کی علت یا تو خود صاحبِ شریعت کی طرف سے متعین اور واضح کردی گئی تھی یا بصورتِ دیگر ائمہ اجتہاد نے قیاس و بصیرت کے ذریعہ اُسے دریافت کیا اور اُس کو حکمِ شرعی کا مدار و محور قرار دے دیا۔ اور پھر ایسے مسائل و معاملات میں، جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول میں موجود نہ تھے لیکن اُن کے بارے میں شرعی حکم دریافت کرنا مطلوب تھا، جہاں جہاں اس علت کو موجود پایا، اُسے منصوص و معلول حکم کے دائرے میں شامل کردیا۔ پھر جب یہ امر بھی ان ائمہ کرام کے نزدیک پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ جب مجتہدین کی جماعت کتاب اللہ کے کسی حکم پر، سنتِ رسول کے کسی فیصلے پر یا قیاس سے ثابت شدہ کسی مسئلے پر کلی اتفاق کرلیتی ہے تو من حیث المجموع ان کے اتفاق میں غلطی اور خطا کا احتمال نہیں رہتا تو ان کے اس موقف سے ایک اور اصلِ شرعی — اجماع — وجود میں آگئی۔ اس طرح سے شرعی احکام کے مآخذ — یا فقہاء کی اصطلاح میں ادلۂ احکام — کی تعداد چار

تک پہنچ گئی: کتاب اللہ، سنت رسول، قیاس اور اجماع ــــ لیکن اگر دیکھا جائے تو اصل مآخذ صرف دو ہی ہیں: کتاب اور سنّت اور باقی دونوں انہی اصل مآخذ کی شاخیں ہیں۔

صحابۂ کرام کا طریقۂ اجتہاد

قرآن جس زبان میں نازل ہوا وہ عربی تھی، سنتِ رسول نے اس کی توضیح و تبیین عربی زبان میں کی۔ اصحابِ رسول فطری طور پر اس زبان سے واقف تھے۔ وہ اس زبان کے معانی و مطالب کا مکمل درک رکھتے تھے، اس کے اسلوبِ بیان اور اندازِ کلام کے اقتضاء سے کماحقہٗ آگاہ تھے۔ ایک طرف وہ خود قلب و نظر کی صفائی و پاکیزگی میں اور ذہن و فکر کی جلا میں یگانۂ روزگار تھے اور دوسری طرف انہیں صاحبِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و مجالست حاصل تھی اور وہ احکامِ شریعت کے وجوہ و اسباب سے باخبر رہتے تھے، اس چیز نے انہیں حکمتِ تشریع کا عارف و رازداں بنا دیا تھا چنانچہ انہیں کتاب و سنت سے احکام کے استنباط میں کسی خارجی ذریعہ کی حاجت نہ تھی اور نہ ہی وہ اعراب و اشتقاق کے قواعد، صرف و نحو کے ضوابط اور اسی قسم کے دوسرے علوم و فنون، جو بعد کی پیداوار ہیں، کے محتاج تھے۔ جب کوئی نیا واقعہ اور نیا مسئلہ انہیں درپیش آتا اور اس کے متعلق انہیں حکمِ شریعت دریافت کرنا مقصود ہوتا، تو وہ بلا تامل کتاب اللہ کی جانب رُخ کرتے۔ اگر کتاب اللہ میں انہیں اپنا مقصد و مطلب حاصل نہ ہوتا تو سنّتِ صحیحہ سے رہنمائی طلب کرتے۔ اگر سنّت سے بھی محروم ہوتی تو پھر وہ اجتہاد و قیاس کا سہارا لیتے۔ ان کا طریقۂ اجتہاد یہ ہوتا تھا کہ وہ کتاب و سنّت میں سے ان احکام کی جستجو کرتے تھے جو پیش آمدہ مسائل و واقعات سے مماثلت و مشابہت رکھتے تھے۔ اور پھر ان نئے مسائل کو انہی ہم شکل اور مشابہت رکھنے والے منصوص احکام کے حکم میں داخل کر دیتے۔ اور اس بارے میں ان تمام مصالح و مراعات کا لحاظ رکھتے جنہیں شریعت نے ہمیشہ اپنے احکام و قوانین میں مدِنظر رکھا ہے ــــ فقہ کی زبان میں اس طریقۂ اجتہاد کو حمل النظیر علی النظیر یا الحاق الاشباہ بالاشباہ سے تعبیر کرتے ہیں ــــ صحابۂ کرام کے اس طریقے کی شہادت ہمیں معاذ بن جبل والی حدیث ملتی ہے، جس میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کی گورنری پر روانہ کیا تو معاذ سے دریافت فرمایا کہ معاذ! تم فیصلے کس طرح کرو گے؟ حضرت معاذ نے سب سے پہلے کتاب اللہ کا نام لیا

کتاب اللہ میں نہ ملنے پر سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کا ذکر کیا اور ان دونوں سرچشموں سے رہنمائی نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد و قیاس کا سہارا لینے کا اظہار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کی اس ترتیب اور راست فکری کی تصدیق فرمادی۔ عہد عمر میں بھی اسی قسم کی مثال دستیاب ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری کو جب قضائے کوفہ کا منصب سونپا تو انہیں منصبِ قضا کی نزاکت و اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور پھر فرمایا: الفہم الفہم فیما تلجلج فی صدرک مما لیس فی کتاب ولا سُنّۃ فاعرف الاشباہ والامثال وقس الامور عند ذالک، واعمد الی اقربہا الی اللہ واشبہہا بالحق (جو چیز تم کو قرآن اور حدیث میں نہ ملے اور تمہیں اس کی نسبت شبہ ہو تو اس میں خوب غور و فکر کرو۔ اس کے ہم شکل اور ہم صورت واقعات دریافت کرو، اور ان پر قیاس کر لو۔ اور اس امر کا خیال رکھو کہ جو بات منشائے الٰہی سے زیادہ قریب اور امرِ حق سے زیادہ مشابہت رکھتی ہو اُسی کو اختیار کرو)

صحابہ کے بعد تابعین کی جماعت بھی اس معاملے میں اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتی رہی۔

قواعدِ لغت کی تدوین کا پس منظر | دورِ صحابہ اور تابعین کے بعد اسلامی فتوحات کی طفیل عرب قوم میں دوسری غیر عرب اقوام کی آمیزش ہوگئی۔ اور عرب و عجم کی ایک مخلوط سوسائٹی وجود میں آگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان جو عربوں کی فطری اور طبعزاد زبان تھی، اب ایک "فن" میں تبدیل ہوگئی، جسے باقاعدہ پڑھا اور پڑھایا جانے لگا، زبان دانی کے لیے قواعد و ضوابط وضع کیے گئے، مختلف کتابوں کی تدوین عمل میں آئی اور پوری سعی کی گئی کہ غیر عرب اقوام کے اختلاط سے عربی زبان ضائع نہ ہو جائے یا اس پر عجمیت کا اس قدر غلبہ نہ ہو جائے کہ وہ اپنی شکل و صورت کو کھو بیٹھے۔ تاہم اپنی حدِ استطاعت کوششوں کے باوجود، روزمرہ گفتگو کی سلاست پسند زبان کو تو اس سیلاب سے یہ لوگ نہ بچا سکے، کیونکہ اس میں اعراب و حرکات کے ترک کر دینے، بعض الفاظ اور صیغوں کو بدل ڈالنے اور ثقیل کلمات کے بجائے ہلکے پھلکے کلمات اختیار کر لینے کی وجہ سے یک گونہ تغیر رونما ہو گیا مگر اہلِ لغت کی یہ کامیابی بھی کچھ معمولی نہ تھی کہ کم از کم انہوں نے لکھنے پڑھنے اور درس و تدریس کی حد تک زبان کو بالکلیہ محفوظ و مصئون رکھا۔ حفاظتِ زبان کے سلسلے میں اس قدر سعی و اہتمام کا مرکزی نقطہ اور بنیادی جذبہ صرف یہ تھا کہ دین کے ستون اور عربی کے مستند علمی خزانے (کتاب

سنت) زمان و مکان کے اثرات سے محفوظ رہیں۔

اصولِ فقہ کی تدوین کا آغاز اس سلسلے میں ائمہ مجتہدین نے بھی ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا، جس نے اہلِ لغت کے مذکورہ بالا کام کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ وہ کارنامہ یہ تھا کہ ائمہ لغت نے براہِ راست عرب اہلِ زبان سے میل جول اور ان سے تعبیر و بیان کے گوناگوں اسالیب کا فہم حاصل کرنے کے بعد جو لغت کے قواعد مرتب کیے تھے، ائمہ مجتہدین نے ان قواعد کی مدد سے اور اپنے اُس علم و عرفان کی مدد سے، جو قدرت نے اُن کو اسلامی قانون کی روح اور مخلوق کو اسلامی قانون کی پابندی کا مکلف بنانے کی حکمتوں کے متعلق ارزانی فرمایا تھا۔ فقہ و تشریع کے قواعد و کلیات مرتب و مدوّن کر دیئے، اور بعد میں یہی قواعد شریعت کے مآخذ سے احکام و مسائل کا استنباط و استخراج کرنے والوں اور اجتہاد کے منصب پر فروکش ہونے والوں کے لیے اساس و رہنما قرار پائے۔

الرسالہ کے مضامین اور اصولِ فقہ میں اس کی حیثیت ہمارے تحقیق و مطالعہ کی رُو سے فقہی اور تشریعی اُصول کی تدوین و تالیف کی طرف سب سے پہلے جنہوں نے دھیان دیا وہ امام محمد بن ادریس شافعی مطلبی[1] ہیں۔ فقہ میں ان کی مشہور کتاب الام کا مقدمہ جو الرسالہ کے نام سے معروف ہے، انہی قواعد پر مشتمل ہے۔ الرسالہ میں امام موصوف نے سب سے پہلے "بیان" کی حقیقت و ماہیت پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قرآن کے بیان، قرآن کے متعلق سنت کے بیان اور اجتہاد و قیاس کے بیان پر جُدا جُدا روشنی ڈالی ہے۔ پھر انہوں نے قرآن کے عام و خاص پر مفصل گفتگو کی ہے۔ ایک بحث میں انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سنّتِ رسول کتاب اللہ ہی کے حکم کی بنا پر واجب الاتباع ہے۔ آخر میں ناسخ و منسوخ، عللِ احادیث، خبرِ واحد کی حجیّت، اجماع، قیاس، استحسان اور اختلافِ علماء کے موضوعات پر بحث کی ہے۔ الغرض ہماری معلومات کی حد تک اربابِ اجتہاد کی رہنمائی کے لیے سب سے پہلے یہی صحیفہ قواعد فقہی دنیا میں معرضِ وجود میں آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ یہ بدیہی امر ہے کہ جب کسی علم اور فن کی تدوین کا آغاز ہوتا ہے تو ابتدائے کار میں اُس کے جو قواعد و ضوابط وضع ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر ناقص و

[1] مصر میں ان کی وفات ہوئی۔ سنِ وفات ۲۰۴ ہجری ہے۔

ناتمام ہوتے ہیں اور اپنی جزئیات پر پوری طرح حاوی اور جامع نہیں ہوتے۔ مثلاً علمِ نحو کی جب اوّل اوّل ایجاد ہوئی تو یہ علم صرف ان چند جملوں سے عبارت تھا جنہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابوالاسود الدؤلی کو املا کرایا تھا لیکن بعد میں بحث و تنقیح کرنے والوں نے انہی جملوں کو اس قدر ترقی دی کہ انہیں مختلف ابواب فصول میں مرتب کیا گیا۔ اُن کی متعدد اقسام و فروع قائم کی گئیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس علم پر مشتمل بڑی بڑی ضخیم اور مفصل کتابیں تیار ہوگئیں۔ بعینہٖ یہی صورت امام شافعی کے الرسالہ کی ہے، چونکہ یہ علمِ اصولِ فقہ کا سب سے پہلا مجموعہ ہے، اسی لیے اس مجموعے کو اس علم کی خشتِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔ البتہ اس خشتِ اوّل کے منصۂ ظہور پر آنے کے نتائج اس قدر دُور رس نکلے کہ جلیل القدر علماء و اربابِ نظر کی معتدبہ تعداد اس کی مزید چھان بین اور ترتیب و تنظیم میں منہمک ہوگئی۔

علم اصولِ فقہ کے چار بنیادی مباحث

اصولِ فقہ کی تالیف سے ان محققین کا مدعا یہ تھا کہ ایسا زینہ مہیا ہو جائے جس کی مدد سے امت کے اہلِ علم و فقہ اور اربابِ قانونِ شریعت کے ماخذ سے احکامِ شریعت تک رسائی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ وہ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی حکم شرعی کو معلوم کرنے کے لیے چار چیزوں کا زیرِ بحث آنا لازم ہے ایک نفسِ حکم دوسرا ماخذِ حکم، تیسرے عملِ استنباط اور چوتھے صاحبِ استنباط۔ چنانچہ انہوں نے انہی چاروں بنیادی پہلوؤں پر اپنی بحثوں کو منحصر کر لیا اور اپنی تمام تر کدوکاوش کا مرکز قرار دے لیا۔ حکم کی بحث میں انہوں نے حکم کے مختلف مراتب: وجوب، امتناع، استحباب، کراہت، اباحت، حسن، قبح اور ادا و قضا، صحت و فساد وغیرہ پر بحث کی۔ ماخذِ حکم کے باب میں انہوں نے اپنی بحث و تحقیق کے دائرے میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کو شامل کیا۔ عملِ استنباط کے زیرِ عنوان ان کی کدوکاوش کا مقصد استنباط کے طریقے اور احکام کی دلالتوں اور تقاضوں کی نوعیت کا جانچنا اور دریافت کرنا ٹھہرا۔ صاحبِ استنباط کے موضوع میں مجتہد کی ذات، اور عملِ اجتہاد کی شرائط و اوصاف زیرِ بحث لائی گئیں۔

علمِ اصولِ فقہ کے دو بڑے اسکول

علمِ اصولِ فقہ کے میدان میں جن حضرات نے دادِ تحقیق و ترتیب دی ہے، وہ کسی ایک مجمعِ علمی کی شکل میں نہ تھے بلکہ مختلف بلاد و امصار میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اُن میں سے

ہر شخص اپنے ہی علاقہ میں بیٹھا اپنے مخصوص نقطۂ نظر اور منشائے تالیف کے مطابق اس کام میں مگن تھا۔ چنانچہ اِس اختلافِ بلاد اور اختلافِ نقطۂ نظر کی وجہ سے محققین اپنے تحقیقی کام میں نہ تو اس فن کے مطالب و حقائق کو ادا کرنے والی اصطلاحات (TERMS) میں متفق القول ہوسکے اور نہ ہی نوعیتِ کار میں ان کے راستے ایک دوسرے سے متحد ہوسکے۔ اور آخر کار علم اصولِ فقہ دو قسم کی اصطلاحات میں بٹ گیا۔ یا صحیح لفظوں میں اس میں دو مدرسہ ہائے فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) معرضِ عمل میں آگئے۔ ایک متکلمین کا مدرسۂ فکر اور دوسرا حنفیہ کا۔

متکلمین کا اسکول اور اس کی خصوصیات اصولِ فقہ کی تالیف میں متکلمین نے جو نظریہ اور اسلوب اختیار کیا وہ علمِ کلام کے زیرِ اثر تھا یعنی یہ لوگ بحث و تحقیق میں علمِ کلام کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔ اور اصول و قواعد کا انضباط کرتے وقت وہ اس امر کا خیال نہیں کرتے تھے کہ فروع میں ان قواعد کی موافقت ہوتی ہے یا مخالفت، عقل اور بُرہان کی کسوٹی جس اصول کو درست اور معقول قرار دے دیتی تھی اس پر مُہرِ توثیق ثبت کر دیتے تھے اور عقل اور بُرہان جس کی نفی کر دیتے اُسے یہ بھی مسترد کر دیتے۔ بہت کم مواقع ایسے آئے ہیں جہاں یہ لوگ اپنے مذہب کی فروع و جزئیات کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ اور وہ بھی محض سرسری نظر سے۔ گویا اس طریقے کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے عقل و حجت کی روشنی میں قواعد مرتب کیے جاتے تھے اور بعد میں فروع پر ان کا اطلاق و انطباق کیا جاتا تھا۔ اس اسکول سے مختلف مذاہب منسوب تھے۔ معتزلہ کا اسکول یہی تھا۔ اہلِ سنت میں سے شافعیہ اور مالکیہ بھی اسی زُمرے میں شامل تھے۔

حنفی اسکول اور اس کی خصوصیات اس کے برعکس حنفی اربابِ اصول کے طریقۂ تدوین میں اس امر کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ جو قاعدہ اور اصول وضع کیا جائے وہ جامع اور ہمہ گیر ہو اور اپنی فروع اور جزئیات پر پوری طرح حاوی ہو۔ چنانچہ فقہائے احناف اُسی قاعدہ کی توثیق اور اُسی ضابطہ کی تائید عمل میں لاتے تھے جو اُن کے ائمہ سے منقول ہونے والے جزئی مسائل اور فروعی احکام کی تائید کرتا تھا۔ اور اُن کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ بلکہ اگر کوئی قاعدہ کسی فقہی مسئلے کی مخالفت کرتا تھا تو اس کی ایسی تراش خراش کر دیتے جس سے فقہی مسئلے کی مخالفت رفع ہو جاتی۔ گویا انہوں نے اُسی رجحان

یا نظریے کو اصول و ضوابط کا لباس پہنا دیا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کے ائمۂ مذاہب نے بھی مسائل و احکام کی تفریع اور تخریج میں اور ان پر شرعی حکم لگانے میں اس کا التزام کیا ہے۔ اس طرزِ فکر کی پابندی نے بعض اوقات ان حضرات سے بڑے بڑے عجیب و غریب اور مضحکہ خیز قاعدے بھی تالیف کرائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں حنفی اصولِ فقہ کے تحت فروع و جزئیات کی کثیر تعداد ملتی ہے۔ اس لیے کہ قاعدے فروع پر اثر انداز نہیں ہوئے بلکہ فروع قاعدوں پر اثر انداز ہوئی ہیں۔

کلامی اسکول کی بڑی بڑی کتابیں | ائمہ متقدمین کی کثیر تعداد نے متکلمین کے طریقہ پر کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان تالیفات میں سے سب سے بڑی بڑی کتب جو ہمارے علم میں آئی ہیں، وہ تین ہیں۔ (۱) ابو الحسین محمد ابن علی بصری معتزلی شافعی (متوفی ۴۶۳ھ) کی کتاب المعتمد۔ (۲) ابو المعالی عبد الملک بن عبد اللہ جوینی نیشاپوری شافعی — جو امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہیں — (متوفی ۴۷۸ھ) کی کتاب البرہان (۳) ابو حامد محمد ابن محمد الغزالی (متوفی ۵۰۵ھ) کی کتاب المستصفیٰ۔ مجھے ان کتابوں میں سے المستصفیٰ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ البرہان کے بعض اقتباسات بھی، جو اسنوی[1] نے المنہاج کی شرح میں نقل کیے ہیں، میری نظروں سے گذرے ہیں۔ عربی اسلوب اور زبان کے لحاظ سے المستصفیٰ کی زبان نہایت شستہ اور بلند پایہ ہے۔ غزالی کے بارے میں یہ تو مشہور ہی ہے کہ موصوف کاغذ کے استعمال میں تنگ دل نہیں ہیں۔ المستصفیٰ میں بھی وہ عنانِ قلم کو پوری چھوٹ دے دیتے ہیں تاکہ وہ جہاں پہنچنا چاہے، پہنچ جائے۔ امام صاحب کا زمانہ تلخیص و مختصر گوئی کے دور سے پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں مؤلفین کے پیشِ نظر اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ قاری کے ذہن میں اپنا مطلب و مفہوم پوری طرح اتار دیں۔ اس سے انہیں بحث نہ ہوتی تھی کہ یہ مقصد مختصر کلام سے حاصل ہوتا ہے یا طولِ کلام سے۔

دو جامع کتابیں: المحصول اور الاحکام | ان مؤلفین کے دور کے بعد کلامی اسکول کی مذکورہ کتب کی طرف دو بڑے جلیل القدر اور وسیع النظر عالم متوجہ ہوئے اور ان دونوں نے کتبِ ثلاثہ کو ایک جامع ملخص کی صورت میں پیش کیا۔ ان میں سے پہلے فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی (متوفی ۶۰۶ھ) ہیں۔ انہوں نے

[1] پورا نام ابو محمد عبد الرحیم ہے۔ بالائی مصر کے شہر اسنا میں ۷۰۴ھ/۱۳۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ ۷۲۱ھ/۱۳۲۱ء سے تعلیم م

المحصول کے نام سے ان تینوں کتابوں کی تلخیص کی ہے۔ دوسرے ابو الحسن علی بن ابی علی شافعی۔ جو سیف الدین آمدی کے نام سے مشہور ہیں۔ (متوفی ۶۳۱ھ) ہیں۔ انہوں نے الاحکام فی اصول الاحکام کے نام سے ان کا خلاصہ مرتب کیا ہے۔ یہ دونوں جامع کتابیں عبارت کے لحاظ سے بڑی مبسوط اور واضح ہیں۔ مطالعہ کرنے والا صرف انہی پر اکتفا کر سکتا ہے۔ اُسے مطلب اور مفہوم سمجھنے کے لیے کسی طویل شرح کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ المحصول کی زبان نسبتہً زیادہ واضح اور سلیس ہے۔ مصر کے دار الکتب الخدیویہ میں المحصول مکمل موجود ہے۔ الاحکام کے بھی اکثر حصّے موجود ہیں۔

المحصول کے مختصرات | بعد میں ان دونوں کتابوں کی متعدد تلخیصات اور مختصرات لکھی گئی ہیں۔ المحصول کا ایک اختصار تاج الدین محمد بن حسن ارموی[1] (متوفی ۶۵۶ھ) نے کیا ہے۔ جو الحاصل کے نام سے معروف ہے۔ ارموی نے یہ اختصار ابو حفص عمر بن الصدر الشہید کے مشورے سے لکھا تھا۔ دوسرا اختصار محمود بن ابی بکر ارموی (متوفی ۶۸۲ھ) نے اپنی کتاب التحصیل میں کیا ہے۔ موصوف کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں: آجکل لوگوں کی ہمتیں اس علم کے اونچے مطالب تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہیں، حتیٰ کہ المحصول اپنے نظم و ترتیب کی شستگی اور حجم کے اعتدال و لطافت کے باوجود اکثر لوگوں کی نگاہ میں بھاری سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ چند احباب نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کو مختصر کر دوں اور مزید اپنی جانب سے اس پر توضیحی نوٹ دے دوں، میں نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے التحصیل کے نام سے اس کا ملخص تیار کیا ہے۔ قاضی عبد اللہ بن عمر بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی کتاب منہاج الوصول الیٰ علم الاصول بھی الحاصل سے ماخوذ ہے۔ مگر یہ بات کہے نہیں رہا جاتا کہ ان تمام حضرات نے اس درجہ زیادہ اختصار سے کام لیا ہے کہ ان کا کلام چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مقصدِ تالیف افہام و تفہیم سے بالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

---

۱ - حاصل کی۔ شافعی المسلک ہیں۔ ان کی تالیفات میں سے ایک المنہاج کی شرح ہے۔ اور ایک رسالہ فی عدم استخدام اہل الذمہ و عدم تبلیغہم عموم المسلمین ہے۔ جو مخطوطے کی شکل میں تونس میں موجود ہے۔ ۷۳۰ھ میں وفات ہوئی۔

۱ ارموی آذربائیجان کے شہر ارمیہ کی طرف منسوب ہیں۔

ان کی کتابیں مزید شروح کی محتاج ہوئیں تاکہ ان کی چیستان کی توضیح اور ان کے معموں کو حل کریں چنانچہ قاضی بیضاوی کی منہاج الوصول کی ایک نہایت عمدہ شرح اسنوی نے لکھی ہے۔ اسنویؒ شرح کے آغاز میں رقمطراز ہیں: "اس زمانے میں علم اصولِ فقہ سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والے اکثر لوگ اس علم کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہو کر صرف المنہاج پر اکتفا کر چکے ہیں۔ کیونکہ یہ کتاب ضخامت کے لحاظ سے چھوٹی ہے۔ لیکن اس میں معلومات اور مطالب بڑی افراط سے جمع ہیں اور اس کی زبان نہایت لطیف اور رواں ہے۔ اسنوی کا یہ تبصرہ میرے لیے بڑا حیرت افزا ہوا۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ المنہاج میں زبان کی لطافت اور روانی کہاں سے آگئی حالانکہ اس کا پورا کلام اغلاق وابہام کا مرقع ہے۔ مجھے جب کبھی کسی مسئلے کے بارے میں اس کی طرف مراجعت کی ضرورت پڑتی ہے تو میں المنہاج کی متن خوانی پر اپنی جان گھلانے کے بجائے المنہاج کے شارح کی طرف رُخ کرتا ہوں اور انہی سے امداد طلب کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسنویؒ جس خوبی سے مطالب کی شرح و تبیین کرتے ہیں۔ اس بارے ان کے ہم پلہ کوئی شارح میری نظر میں نہیں آیا۔

الاحکام کے مختصرات آمدی کی کتاب الاحکام کا اختصار سب سے پہلے ابو عمرو عثمان بن عمر المعروف با بن حاجب المالکی (متوفی ۶۴۶ھ) نے کیا ہے۔ یہ اختصار منتہی السؤل والامل فی علم الاصول والجدل کے نام سے موسوم ہے، اور علمی حلقوں میں خاصا شہرت یافتہ ہے۔ ابن حاجب نے اپنے اسی مجموعے کا ایک اور خلاصہ لکھا اور اسے مختصر المنتہی کا نام دیا۔ اس خلاصے کی عبارت المنہاج سے ملتی جلتی ہے۔ مختصر المنتہی کی سب سے بہترین شرح عضدالدین عبدالرحمٰن بن احمد ایجیؒ[1] (متوفی ۷۵۶ھ) کی ہے لیکن اپنی عمدگی کے باوجود اسنوی کی شرح المنہاج سے کم پایہ ہے۔

حنفی اسکول کی بڑی بڑی کتابیں اصولِ فقہ میں حنفیہ کے طرزِ تدوین پر اصول کی کتابیں تالیف کرنے والوں کی بھی کثیر تعداد ملتی ہے۔ جو زمانۂ قدیم کے نوابغ ارباب اصول سے لے کر متاخرین کے دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ متقدمین میں سے جن بزرگوں نے اس فن کو غیر معمولی نشو و نما دی ہے اور اس پر

[1] ایجی کی نسبت مدینہ ایج کی طرف ہے۔ یہ شہر فارس کے شمال میں آخری کنارے پر واقع ہے۔

نہایت ضخیم و بسیط مجموعے تصنیف کیے ہیں ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء گرامی نمایاں ہیں:۔

۱- ابوبکر احمد بن علی۔ یہ بالعموم جصاص کے لقب سے موسوم ہیں۔ ان کا سن وفات ۳۷۰ھ ہے۔

۲- ابوبکر عبید اللہ بن عمر القاضی الدبوسی[1]۔ متوفی ۴۳۰ھ۔

۳- شمس الائمہ محمد بن احمد السرخسی[2]۔ متوفی ۴۸۳ھ۔

میرے مطالعہ میں متقدمین کی کتابوں میں سے سب سے عمدہ اور مفید کتاب فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی[3] (متوفی ۴۸۲ھ) کی کتاب الاصول آئی ہے۔ علاؤ الدین عبد العزیز بن احمد البخاری (متوفی ۷۳۰ھ) نے اس کی ایک نہایت بلند پایہ اور عظیم شرح بھی لکھی ہے۔ متأخرین حنفیہ میں سے علم اصول پر سب سے مشہور کتاب عبد اللہ بن احمد نسفی کی کتاب المنار ہے۔

دونوں مدرسہ ہائے فکر کی جامع کتب متأخرین حنفیہ اور دوسرے مذاہب کے علماء کا ایک گروہ ایسا بھی گذرا ہے جس نے حنفیہ اور متکلمین کے دونوں طریقوں کی جامع کتب لکھی ہیں۔ مثلاً بغداد کے مشہور حنفی عالم مظفر الدین احمد بن علی الساعاتی (متوفی ۶۹۴ھ) نے فخر الاسلام بزدوی کی الاصول اور آمدی کی الاحکام کا ایک مجموعہ تالیف کیا ہے جس کا نام "بدیع النظام الجامع بین کتاب البزدوی والاحکام" ہے اسی نوعیت کی ایک کتاب صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود بخاری حنفی (متوفی ۷۴۷ھ) نے تنقیح الاصول کے نام سے تحریر کی ہے۔ پھر صدر الشریعہ نے خود ہی التوضیح کے نام سے اس کی شرح کی ہے تنقیح الاصول بزدوی کی الاصول، رازی کی محصول اور ابن حاجب کی تلخیص منتہی السؤل کا ملخص ہے۔ صدر الشریعہ کی شرح التوضیح پر شافعی عالم سعد الدین مسعود ابن عمر تفتازانی (متوفی ۷۹۲ھ) کا حاشیہ بھی بہت بڑی

[1] دبوسیہ سمرقند کے صدر مقام صغد کے ماتحت شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے۔ ابوزید اسی شہر کے رہنے والے تھے اور اسی وجہ سے دبوسی کہلائے۔ یاقوت نے ان کا سن وفات ۴۳۰ھ لکھا ہے۔ [2] سرخس خراسان کے نواح میں ایک شہر کا نام ہے اور نیشاپور اور مرو کے درمیان واقع ہے۔ اسے سرخس بفتح راء بھی پڑھتے اور سرخس بسکون راء بھی

[3] بزدہ نسف سے ۱۴ میل کے فاصلے پر ایک نہایت محکم اور مضبوط قلعے کا نام ہے۔ نسف دریائے جیحوں اور سمرقند کے درمیان ایک بہت بڑا شہر ہے۔ بزدوی قلعہ بزدہ کی جانب منسوب ہیں۔

شہرت کا حامل ہے علیٰ ہذا القیاس، کمال الدین محمد بن عبدالواحد حنفی ۔ جو عام طور پر ابن ہمام کے نام سے شہرت رکھتے ہیں ۔ (متوفی ۸۶۱ھ) کی کتاب التحریر اور التحریر کی شرح، جو ابن ہمام کے شاگرد محمد بن محمد امیر حاج الحلبی (متوفی ۸۷۹ھ) نے لکھی ہے اور تاج الدین عبدالوہاب بن علی السبکی شافعی (متوفی ۷۷۱ھ) کی کتاب جمع الجوامع دونوں اسکولوں کی جامع کتب کی فہرست میں شامل ہیں ۔ تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب جمع الجوامع کے شروع میں تصریح کی ہے کہ ان کی یہ کتاب فنِ اصول کی تقریباً یکصد کتابوں کا نچوڑ ہے ۔

مذکورہ کتب کی خصوصیات | مذکورۂ بالا کتب، جن میں فنِ اصول کی ہر بات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، ایجاز و اختصار کا انتہائی نمونہ ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی عبارت بالکل ایک پہیلی اور کلامِ مُعجز کی صورت اختیار کر گئی ہے ۔ اور زبان کے لحاظ سے بھی عربیت سے بالکل غیر مانوس معلوم ہوتی ہیں ابن ہمام کی التحریر کو تو اس معاملے میں سبقت حاصل ہے۔ اس کو شرح سے الگ کر کے اگر کوئی شخص پڑھے اور قائل کی مراد معلوم کرنا چاہے تو اس کے لیے سعی و محنت کا اسی قدر سرمایہ درکار ہوگا جس قدر معمّوں کو حل کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اگر اسے ابن حاجب کی شرح کی طرف رجوع کرنے سے پہلے پڑھا جائے اور بعد میں ابن حاجب کی شرح کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف ابن حاجب کی عبارت کو لیتا ہے اور اس کی اس قدر تراش خراش کرتا ہے اور اس کے الفاظ و تراکیب کو اُدل بدل کرتا ہے کہ عبارت مضطرب اور پیچیدہ ہو جاتی ہے اور اس میں اغلاق کی کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔ سبکی کی جمع الجوامع مختلف اقوال کے مجموعے سے عبارت ہے۔ کوئی قاری یا سامع اس کے متن سے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے تو اسے کامیابی نہیں ہوگی۔ علاوہ ازیں اس میں اصولِ فقہ کے جن قواعد و ضوابط کو ذکر کیا گیا ہے ان کا استدلال و استناد سرے سے مفقود ہے۔

دورِ جمود میں اصولِ فقہ کی حالت | بعد کے ادوار میں علمِ اصولِ فقہ کے جس قدر مصنّفین و مؤلفین آئے ہیں اُن سب کی تگ و دو صرف کتبِ سابقہ کی تشریحات اور حاشیہ نویسی تک محدود رہی ہے۔ اس علم

میں انہوں نے اپنی جانب سے کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا اور نہ اس کے کسی پہلو کو مزید ارتقاء دینے کی کوشش کی۔ ان کا سرمایۂ محنت زندگی بھر اسی میں کھپتا رہا کہ وہ ملخصات کی تشریح کریں۔ ژولیدہ عبارتوں کو حل کریں۔ پیچیدہ اور مبہم کلام کو واضح اور بامعنی کریں۔ ان کے اپنے اندر اجتہاد و فکر کی قوتیں بانجھ پن کا شکار اور ترجیح و انتخاب کا ذوق تقریباً ناپید ہو چکا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان ادوار میں اجتہاد کے دروازے پر قفل لگ چکے تھے۔ جس کی وجہ سے علمِ اصولِ فقہ کی حیثیت آثارِ کہنہ (RELICS) کی سی ہو گئی تھی۔ اس لیے اصولِ فقہ کی بحثوں میں پڑنے اور استنباط و قیاس کے قاعدوں (جن کا تعلق اجتہاد سے ہے) میں قابلیتیں اور محنتیں صرف کرنے کی کوئی ضرورت اور کوئی افادیت محسوس نہ کی گئی۔ متاخرین کی کتب میں سے دقیق ترین کتاب مُسلّم الثبوت ہے، جس کے مؤلف محب اللہ بن عبد الشکور (متوفی ۱۱۱۹ھ) ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ اصولِ فقہ پر اس کثرت اور وسعت سے لٹریچر وجود میں آیا ہے، لیکن اصحابِ اصول میں سے کسی نے ان اصولوں اور کلیتوں کے بارے میں راہوارِ قلم کی جولانی نہیں دکھائی۔ جن اصولوں اور کلیوں کو خود صاحبِ شریعت نے تشریع و تقنین کے باب میں معتبر و ملحوظ رکھا ہے۔ اور یہی اصول فی الحقیقت قیاس اور استنباط کا مبنیٰ اور اساس ہیں۔ کیونکہ قیاس کی اصل روح وہ علتیں ہیں جو شریعت کے احکام میں کارفرما ہیں اور ان کا مدار و مناط ہیں۔ ان علتوں کا ایک حصہ وہ ہے جن کا مدارِ حکم ہونا خود شارع سے منصوص ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جن کا استخراج مجتہدینِ امت نے کیا ہے اور ان کو احکام میں معتبر و مؤثر گردانا ہے۔ انہی علتوں سے وہ اصول و قواعد مرتب ہوئے ہیں جن پر قیاس کی عمارت قائم ہے۔ چنانچہ بہتر یہ تھا کہ ذہن و فکر کا زیادہ تر زور انہی اصولوں کی توضیح و ترتیب پر صرف کیا جاتا، تاکہ یہ اصول مجتہدین و فقہاء کے لیے مشعلِ راہ بنیں۔ اور اجتہاد و استنباط کا کارواں انہی کی روشنی میں پوری تازگی کے ساتھ رواں دواں رہے۔ یہ کام اس سے بہتر اور نتائج کے لحاظ سے بڑا مفید ہے کہ وقت اور قوت کو خلافیات و جدلیات میں اکارت کیا جائے اور ایسے مسائل پر کشمکش برپا رکھنے میں ضائع کیا جائے، جن کی مخالفت یا موافقت پر کوئی حکم شرعی مترتب نہیں ہوتا۔ غالباً اربابِ اصول نے ان قواعد و کلیات پر بحث و تحقیق کا کام فقہاء اور مجتہدین کے لیے مختص کر دیا تھا، حالانکہ ان کا زیادہ تعلق اصولِ فقہ کے

فن سے ہے۔

اصولِ فقہ پر بہترین کتاب ابو اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی (متوفی سنہ ۷۸۰ھ) کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انہوں نے مذکورہ بالا امور کی جانب توجہ مبذول کی ہے، اور اصولِ فقہ میں صاحبِ شریعت کے اختیار کردہ اصولوں کو بھی لیا ہے اور ان کی تشریح و توضیح کی ہے۔ اس لحاظ سے شاطبی کی الموافقات کو میں نے بہترین کتاب پایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب عظیم فائدوں کی حامل ہے۔ عبارت و اندازِ بیان نہایت سہل اور رواں ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے کسی دوسری کتاب کی حاجت باقی نہیں رہتی، تو اس میں کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ والسلام۔

(ترجمہ و ترتیب:۔ خلیل حامدی)